ڈاکٹر محمد کامل حسین
ترجمہ: ڈاکٹر منور حسین

امام مالک بن انسؒ

اوران کی کتاب الموطأ

انسانی تاریخ کی یہ قدیم روایت رہی ہے کہ وہ اپنے عظیم لوگوں کے احوال وکوائف دریافت کرتی ہے، اورانہیں محفوظ رکھتی ہے۔ یہ عظمت انہیں اس وجہ سے حاصل ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگیوں پر انمٹ نقوش ثبت کرتے ہیں، بالخصوص ایسے لوگوں کے حالات وکیفیات ضرور ہی معلوم کیے جاتے ہیں جنہوں نے دینی عقائد واحکام میں کوئی مرتبہ امتیاز حاصل کیا ہو، اس لیے کہ یہ عقائد ہی ہمیشہ سے انسانی معاشرے کے قیام وبقا کا اہم ترین ذریعہ رہے ہیں۔

مسلمانوں نے بھی اپنی عظیم دینی وملی شخصیات کی سیرت وسوانح کو محفوظ کرنے کا خاصا اہتمام کیا ہے۔ چناں چہ سیرت وسوانح اور طبقات ومناقب کا جو عظیم ذخیرہ مسلمانوں کے یہاں ملتا ہے، دنیا کی کسی قوم کے پاس اس کی نظیر نہیں ہے۔

حضرت امام مالک کی شخصیت اس اعتبار سے بہت ممتاز ہے کہ جب سے فقہ مالکی متعارف ہوئی ہے اوران کی کتاب الموطأ لوگوں کے سامنے آئی۔ اس وقت سے سیرت نگاروں نے ان کی شخصیت وسیرت کو سب سے زیادہ قابل اعتنا گردانا ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب الموطأ کا شمار بھی ان عظیم تصانیف میں ہوتا ہے، جن کی روایت اور شرح وتعلیق کی طرف اہل علم نے سب سے زیادہ توجہ کی ہے۔ ان تمام کوششوں کے باوجود ابھی تک نہ ان کی سیرت کا حق ادا ہوسکا ہے اور نہ ہی الموطأ کی خدمت کا۔ چناں چہ اس بات کی ضرورت ہے کہ امام مالک کی

شخصیت کا مختلف پہلوؤں سے مطالعہ کی جائے۔ امام مالک کا خاندان کیسا تھا؟ جاہلیت اور اسلام میں اس کا مرتبہ کیا تھا؟ امام مالک کی زندگی کیسی تھی؟ جس معاشرے کے وہ فرد تھے، اس کی سیاسی، مذہبی اور اقتصادی حالت کیا تھی؟ امام مالک کے اساتذہ کون تھے؟ ان کے راویوں پر ان اساتذہ کے کیا اثرات پڑے؟ امام مالک کے شاگردوں کی تعداد کتنی تھی؟ اور ان کا مسلک کس طرح پھیلا؟ میں اس مضمون میں انتہائی اختصار کے ساتھ اپنے مطالعے کا ماحصل پیش کرتا ہوں۔

نسب

امام مالک کی ولادت صحیح ترین قول کے مطابق ۹۳ھ میں ہوئی۔ والد کی طرف سے ان کا نسب دور جاہلیت کے قبیلہ حمیر سے جاملتا ہے۔ ان کے پردادا ابو عامر بن عمرو کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ صحابی تھے اور بدر کے سوا تمام غزوات میں رسول کریم کی معیت کا شرف انہیں حاصل ہوا، اور دوسرا قول یہ ہے کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد اسلام لائے تھے۔ اسی اختلاف کی بنیاد پر ان کے دادا مالک بن ابی عامر کے بارے میں بھی آرا مختلف ہوگئی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ وہ اس خاندان کے پہلے فرد ہیں، جنہوں نے یمن سے حجاز کا سفر کیا اور ان کا شمار ان تابعین میں ہوتا ہے، جنہوں نے صحابہ کرام سے احادیث کی روایت کی اور انہیں عہد عثمانی میں قرآن مجید کی کتابت کا شرف بھی حاصل ہوا۔

اساتذہ وشیوخ

امام مالک نے بہت چھوٹی عمر ہی سے حصول علم کا آغاز کیا، چناں چہ علمائے مدینہ کی ایک بڑی تعداد سے آپ نے کسب فیض کیا، آپ کے اساتذہ میں سے جس شخصیت نے آپ کی علمی وفکری شخصیت کی تشکیل میں سب سے نمایاں کردار ادا کیا، ان کا نام نامی ابوبکر عبداللہ بن یزید (متوفی ۱۴۸ھ) ہے، جو ابن ہرمز کے نام سے معروف ہیں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ میں ابن ہرمز کی خدمت میں علی الصباح حاضر ہو جایا کرتا، پھر رات ہی میں وہاں سے واپسی ہوتی۔ امام مالک کا یہ معمول سات یا آٹھ سال تک جاری رہا۔ امام طبری نے محمد بن الحسن بن زبالۃ کے

حوالے سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ میں جب ابن ہرمز کے پاس آتا تو ان کے حکم سے ان کی خادمہ دروازہ بند کر دیتی اور پردہ گرا دیتی۔ پھر آپ اس امت کے ابتدائی حالات بیان کرتے اور روتے جاتے، یہاں تک کہ آپ کی ڈاڑھی تر ہو جاتی۔ ان واقعات سے امام مالک اور ابن ہرمز کے مابین تعلق کی نوعیت بہ خوبی واضح ہوتی ہے۔ اس خصوصی تعلق ہی کی بنا پر ابن ہرمز نے بہت سے راز کی باتیں بتائیں، جن کے لیے وہ کسی اور کو موزوں نہیں سمجھتے تھے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ابن ہرمز کے بارے میں ہمیں کتب طبقات سے کوئی بات معلوم نہیں ہوتی اور یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ امام مالک نے ان سے کتنا استفادہ کیا، موطا کے راویوں میں بھی ان کا نام نہیں آتا۔ البتہ ابن جریر نے ابوجعفر منصور کے خلاف نفس زکیہ (محمد بن عبداللہ) کی بغاوت کے سلسلے میں ابن ہرمز کا ذکر کیا ہے۔ قدامہ بن محمد لکھتے ہیں کہ ابن ہرمز اور محمد بن عجلان محمد بن عبداللہ کے ساتھ نکلے، جب جنگ کا وقت آیا تو ان دونوں نے ایک ایک کمان سنبھال لی۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ لوگوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ اس کام کے لیے بھی موزوں ہیں۔ طبری نے عبداللہ بن برقی کے حوالے سے یہ بیان کیا ہے کہ جب وہ جنگ ختم ہوگئی تو میں نے عیسیٰ کی فوج کے ایک سپہ سالار کو دیکھا کہ وہ اپنے لشکریوں کے ساتھ ابن ہرمز کی قیام گاہ معلوم کر رہا تھا۔ ہم نے اسے ان کا پتا بتا دیا۔ وہ اس حال میں ان کے پاس آئے کہ ان کے جسم پر کفنی کپڑے کی قمیص تھی۔ انہوں نے اپنے سپہ سالار کو اس کے ترکی گھوڑے سے اتار کر ابن ہرمز کو اس پر سوار کیا اور انہیں لے کر عیسیٰ کے پاس پہنچے۔ وہ انہیں دیکھ کر خفا نہیں ہوا، بس اتنا کہا کہ آپ کی فقہ (دینی بصیرت) نے آپ کو خروج کرنے والوں کا ساتھ دینے سے کیوں نہیں روکا؟ ان کا جواب تھا کہ وہ ایک فتنہ تھا، جس نے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا تو میں بھی اس کی زد میں آ گیا، اس نے کہا: واپس چلے جائیے۔ اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن ہرمز اپنے زمانے میں اپنی فقہی بصیرت کی وجہ سے کس قدر مقبول و معروف تھے کہ انہوں نے کمان محض اس لیے سنبھال لی تھی کہ لوگ آپ کو دیکھ کر اس مہم میں شریک ہو جائیں۔ البتہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ امام مالک کو انہوں نے کون سی راز کی باتیں بتائی تھیں۔ ہم اس وقت تک اس معاملہ میں کوئی قیاسی بات بھی نہیں کہہ سکتے، جب تک کہ ابن ہرمز کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں۔

امام مالک کے ایک استاد ابن شہاب زہری (متوفی ۱۲۴ھ) ہیں اپنے زمانے میں

مدینے کے بڑے علما میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ حدیث کے ابتدائی تدوین کاروں میں بھی ان کا شمار ہے۔ شام کے اموی علما میں آپ کا خاص مقام تھا۔ آپ نے وہاں ایک عرصے تک قضا وافتا کی ذمے داریاں ادا کیں۔ جب آپ مدینہ آئے تو طالبان دین کا ایک جم غفیر آپ کے گرد اکٹھا ہوگیا۔ امام مالک بھی اسی گروہ میں شامل تھے۔ موطأ میں ان سے مروی ایک سو بتیس احادیث ہیں۔ ان میں سے بانوے احادیث بالاسناد ہیں اور باقی منقطع اور مرسل ہیں۔

امام مالک کے دوسرے استاد ربیعہ بن ابوعبدالرحمٰن (متوفی ۱۳۶ھ) ہیں۔ امام مالک کہتے ہیں کہ ربیعہ کے انتقال کے بعد فقہ کی حلاوت جاتی رہی۔ سوار بن عبداللہ کی رائے ہے کہ میں نے ربیعہ سے بڑا عالم نہیں دیکھا۔ امام مالک ان کی مجلس میں شریک ہوئے اور ان سے حدیث کی روایت کرتے۔ لیث بن سعد کا بیان ہے کہ امام مالک بعض وجوہ سے ربیعہ سے اختلاف رکھتے تھے۔ امام مالک کو ربیعے کے مجلس کی بعض باتیں ناگوار گزرتیں، یہاں تک کہ وہ ان سے علیحدہ ہوجانے پر مجبور ہوئے۔ لیث بن سعد کا یہ بیان اس بات کی دلیل ہے کہ امام مالک مجلس ربیعہ سے علیحدگی کے وقت بچے نہیں تھے، بل کہ عمر کی اس منزل کو پہنچ چکے تھے کہ ربیعہ کے بعض خیالات سے اختلاف کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایسا وہی شخص کرسکتا ہے جو فکری اعتبار سے پختگی کی منزل تک پہنچ چکا ہو اور اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک ربیعہ کی مجلس میں حاضر ہوتے رہے۔ چناں چہ موطا میں امام ربیعہ سے مروی کل بارہ احادیث ہیں۔ جن میں پانچ مسند ہیں، ایک مرسل ہے اور چھ روایات وہ ہیں جن کی اسناد متصل نہیں ہیں۔

امام مالک نے حضرت نافع مولی عبداللہ بن عمر (متوفی ۱۲۰ھ) سے بھی احادیث کی روایت کی ہے۔ حضرت نافع کی فضیلت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے انہیں اہل مصر کو قرآن وسنت کی تعلیم کے کام پر مامور فرمایا تھا، وہ اپنی دینی بصیرت کی وجہ سے فقیہ مدینہ کے لقب سے مشہور تھے۔ امام مالک جب ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوئے، اس وقت پختہ عمر کے نوجوان تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب نافع عن ابن عمر کی سند سے کوئی حدیث سن لیتا تو پھر مجھے کسی اور سے اس روایت کی تصدیق وتوثیق کی فکر نہ ہوتی۔ محدثین کہتے ہیں کہ مالک عن نافع عن ابن عمر کی سند سے مروی احادیث اپنے راویوں کی عظمت شان کی وجہ سے

سلسلۃ الذہب (سنہری کڑی) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ امام مالک نے موطا میں ان سے مروی اسّی (۸۰) احادیث نقل کی ہیں۔

مورخین کا بیان ہے کہ امام مالک کے ایک استاد امام جعفر صادق بھی تھے۔ امام جعفر کا شمار شیعی علما میں ہوتا ہے۔ وہ علمی و دینی حیثیت سے مدینے کے بڑے علما میں شمار ہوتے تھے۔ شیعہ حضرات ان کے واسطے سے بہت سی احادیث بیان کرتے ہیں، جو شیعی کتابوں ہی میں ملتی ہیں۔ ان احادیث کے لیے علامہ مجلسی کی بحار الانوار اور قاضی نعمان بن محمد بن حیون المغربی کی تالیف دعائم الاسلام کا مطالعہ کافی ہوگا۔ ان کے معتقدین نے ان احادیث کے انتساب ہی پر اکتفا نہیں کیا، بل کہ علم کیمیا کی متعدد تصانیف اور فلکیات، ریاضیات اور جفر وغیرہ علوم پر مبنی متعدد تالیفات بھی ان سے منسوب کی ہیں۔ لیکن اکثر محققین کی رائے یہ ہے کہ ان کی طرف منسوب روایات و تالیفات کا جو ذخیرہ ہے، وہ ابھی ثبوت و استدلال کا محتاج ہے۔ چناں چہ محدثین کے نزدیک امام جعفر کی شخصیت کی دو مختلف تصویریں ہیں۔ ایک تصویر تو عالم و زاہد امام کی ہے، جو علمائے اہل سنت اور معتدل مورخین کے یہاں نظر آتی ہے اور دوسری تصویر وہ ہے جو غلو کرنے والے شیعوں نے پیش کی ہے اور اس کی انتہائی شکل ابوالخطاب اسدی کے یہاں نظر آتی ہے۔ جس سے خود شیعہ کتابوں کے مطابق امام جعفر صادق نے بھی اظہار برائت کیا تھا اور اسے قابل گردن زدنی قرار دیا تھا۔ امام جعفر کی نسبت یہ بات معروف ہے کہ انہوں نے شیعوں کی برپا کی ہوئی سیاسی تحریکات میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ اور نہ ہی انہوں نے اپنی امامت و قیادت کا کبھی دعویٰ کیا۔ بل کہ وہ امویوں اور عباسیوں کے ارباب حل وعقد سے مصالحت کو ترجیح دیتے تھے۔ اسماعیلی فرقے کا مورخ ادریس اپنی کتاب عیون الاخبار کی جلد چہارم میں یہ واقعہ بیان کرتا ہے کہ ابو مسلم خراسانی نے ایک مرتبہ امام جعفر کے پاس ایک قاصد اس درخواست کے ساتھ بھیجا کہ وہ اپنی امامت و قیادت کا اعلان کر دیں۔ امام صادق نے خط پڑھتے ہی اسے چاک کر دیا اور قاصد کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے، وہ ابو مسلم سے بلا کم و کاست بیان کر دینا۔ اس واقعے کی صحت و سقم سے قطع نظر اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام جعفر صادق کو حکومت اور دنیوی سربراہی کی مطلق خواہش نہ تھی۔ آپ کی سیرت کا جب یہ حال ہو تو یہ بات بعید نہیں کہ اہل سنت علما میں سے کسی عالم نے ان سے استفادہ کیا

ہو۔ اگر صاحب دیباج کی یہ روایت صحیح ہے کہ امام مالک نے فلکیات وریاضیات پر بھی بعض کتابیں لکھی ہیں تو اس کا قوی امکان ہے کہ انہوں نے امام جعفر سے یہ علوم سیکھے ہوں گے۔ انہوں نے موطا میں ان سے نو احادیث روایت کی ہیں، جن میں سے پانچ متصل الاسناد ہیں، اگر چہ وہ سب ایک ہی حدیث کی مختلف روایتیں ہیں اور وہ ہے حج کے سلسلے میں حضرت جابر کی طویل حدیث۔ بقیہ چار احادیث منقطع ہیں۔

امام مالک نے ان مشہور ومعروف علما کے علاوہ حج کے لیے حجاز آنے والے علما کی ایک کثیر تعداد سے فیض اٹھایا اور ان سے احادیث کی روایت بھی کی۔ انہوں نے طلب علم کے لیے کوئی سفر نہیں کیا جب کہ علمی اسفار اس زمانے کے اہل علم، خاص طور پر محدثین کی زندگی کا لازمہ تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ بعض دیگر علما کی طرح ان کا بھی یہ خیال رہا ہو کہ علم تو دراصل مدینے کا علم ہے، یعنی وہیں کا علم مستند ہے۔ لیث ابن سعد کہتے ہیں کہ مجھے کچھ کہتے ہوئے اندیشہ محسوس ہوتا ہے، اس لیے کہ لوگ میرے فتاویٰ پر اعتماد کرتے ہیں۔ وہ دین کے معاملے میں اہل مدینہ کے تابع ہیں، اس لیے کہ مدینے کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کی طرف ہجرت ہوئی، وہیں قرآن مجید نازل ہوا، اسی سرزمین کو رسول کریم کی اقامت گاہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسی لیے امام مالک نے کسی علمی سفر کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس وقت تک اہل مدینہ کا علم مستند، بے میل، قطعی اور صحیح تھا۔

سیاسی وثقافتی حالات

امام مالک کی زندگی ہی میں عالم اسلام ہیجان انگیز صورت حال سے دوچار ہوا، جس کے گہرے اثرات سیاسی، اجتماعی اور علمی معاملات پر مرتب ہوئے۔ ان ہی ایام میں عباسیوں کا دعوائے خلافت سامنے آیا، اموی حکومت کا زوال ہوا، اور عباسیوں کو حکومت واقتدار حاصل ہوا۔ عباسیوں نے امویوں پر بے انتہا ظلم وستم کیے، ان کے بے شمار افراد کو قتل کیا۔ ایک حکومت کا خاتمہ اور دوسری حکومت کا قیام فطری طور پر عوام الناس میں اضطراب پیدا کر دیتا ہے۔ لوگوں کی ذہنی اور اجتماعی بے اطمینانی ان کے اندر مختلف قسم کے رویوں کو جنم دیتی ہے۔ کچھ لوگ تقیہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کا اظہار نہیں کرتے، کچھ لوگ

موجودہ صورتِ حال کو تسلیم کر لیتے ہیں اور جو واقعات رونما ہو رہے ہوں، ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے تو کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں، جو نئی حکومت سے اظہار وفاداری کو ہی مناسب خیال کرتے ہیں، تاکہ انہیں دربار کا تقرب حاصل ہو جائے اور چند لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں، جو قدیم حکومت کے احیا کی کوششوں میں ممد و معاون بن جاتے ہیں۔ تاریخ کے ہر دور میں اس صورت حال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جس وقت عباسیوں کو حکومت ملی، اس وقت بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ عباسیوں کو امویوں کی طرف سے اس قدر اندیشہ نہیں تھا، جتنا وہ علویوں کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ سارا خطہ حجاز بالخصوص مدینہ علویوں کا مرکز تھا۔ مشہور شیعی امام جعفر صادق کا تعلق وہیں سے تھا، وہیں سے محمد بن عبداللہ (نفس زکیہ) نے ۱۴۵ھ میں خروج کیا، علمائے مدینہ کی ایک تعداد بھی ان کے ساتھ تھی، جن میں امام مالک کے ایک استاد ابن ہرمز بھی شامل تھے۔ البتہ امام مالک اس خروج میں کوئی مثبت کردار ادا نہ کرنے کے لیے خود کو مجبور و معذور پاتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے امام مالک کو بنو حسن کے پاس جانے والے وفد کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ وہ عبداللہ کے دونوں صاحب زادوں محمد اور ابراہیم کو خلیفہ کے حوالہ کر دیں، لیکن جب محمد اور ابراہیم نے علم بغاوت بلند کر دیا تو امام مالک کے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ وہ اس اقدام میں ان کا ساتھ دیتے، اس لیے کہ کل وہی ان دونوں کو خلیفہ کے حوالے کرنے کے لیے قاصد بن کر گئے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ منصور کے حامی تھے، بل کہ وہ اس کے ظلم کو سخت ناپسند فرماتے تھے۔ جب اہل مدینہ ان سے سوال کرتے کہ کیا محمد کے ساتھ بغاوت میں شریک ہونا صحیح ہے۔ جب کہ وہ ابو جعفر منصور کی خلافت کو تسلیم کر چکے ہیں تو ان کا جواب ہوتا کہ تم نے حالت جبر میں بیعت کی ہے اور کسی مجبور کیے ہوئے شخص پر کسی عہد کی پاس داری شرعاً ضروری نہیں ہے۔

اس سیاسی اتھل پتھل کی بنا پر امام مالک امور سے لاتعلق ہو گئے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ امام صاحب انتہائی صاحب مروت، بہت زیادہ خاموش رہنے والے، کم گو، اپنی زبان کی حفاظت کرنے والے اور لوگوں کی خاطر و مدارات میں سب سے آگے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود انہیں عباسیوں کے عتاب کا شکار ہونا پڑا، اور انہیں کوڑوں کی سزا دی گئی۔ اس تعذیب کی وجہ کیا تھی؟ اس کے بارے میں تاریخی بیانات مختلف ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ

نفس زکیہ کے خروج کے معاملہ میں انہوں نے جو فتویٰ دیا تھا، وہی فتویٰ اس تعذیب کا سبب بنا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ منصور نے انہیں عہدۂ قضا کی پیش کش کی تھی جسے انہوں نے قبول نہیں کیا، آپ کے اس انکار کو حاکم کے ساتھ عدم تعاون پر محمول کیا گیا اور آپ کو سزا دی گئی۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ منصور نے انہیں حکم دیا تھا کہ وہ طلاق مکرہ والی حدیث کی روایت نہ کریں، آپ نے اس کے حکم کو تسلیم نہیں کیا، چناں چہ اس کی تعذیب کا شکار ہوئے۔ امام مالک کے ایک شاگرد یحییٰ بن بکیر کہتے ہیں کہ امام صاحب کو حضرت علی پر حضرت عثمان کی تفضیل کی وجہ سے یہ سزا دی گئی۔ طالبیوں کی چغل خوری کی وجہ سے آپ اس عتاب کا شکار ہوئے۔ قدمانے ابن بکیر کے اس قول کو مسترد کیا ہے۔ جب ابن بکیر سے یہ کہا گیا کہ آپ نے اصحاب مالک سے اس معاملے میں اختلاف کیا ہے تو وہ کہنے لگے کہ میں ان کے اصحاب سے زیادہ باخبر ہوں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس معاملے میں ابن بکیر سے چوک ہوئی ہے۔ اس لیے کہ منصور کے زمانے میں طالبیوں کا اس قدر عمل دخل نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کو اس طرح کے معاملے میں سزا دلوا سکیں اور یہ بات بھی قابل تسلیم نہیں ہے کہ ترجیح عثمانؓ کا معاملہ عباسیوں کی ناراضگی کی وجہ بن جائے گا۔ وہاں تو صورت حال بالکل برعکس تھی۔ عباسی حکم راں حضرت علیؓ کے فضائل کو کم کر کے دکھانا اور دوسرے صحابہ کو ان پر فوقیت دینا چاہتے تھے۔ اس معاملے میں نفس زکیہ کے نام پر ابو جعفر منصور کے اس خط کا مطالعہ کافی ہوگا، جس میں فضائل علیؓ کے بارے میں منصور کے تنقیصی رویے اور دیگر اصحاب کی ترجیح کا رویہ سامنے آتا ہے۔ منصور نے انہیں لکھا تھا کہ آپ نے حضرت علی کی نسبت جو فخریہ کلمات کہے ہیں تو اس کی حقیقت اس سے واضح ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو آپ ﷺ نے حضرت علی کے علاوہ دوسرے کو امامت کا منصب سونپا۔ پھر لوگوں نے خلافت کے لیے یکے بعد دیگرے دوسروں کو منتخب کیا۔ تیسرے مرحلے میں وہ چھ اصحاب شوریٰ میں شامل کیے گئے۔ اس موقع پر بھی انہیں منتخب نہیں کیا گیا۔ حضرت عبدالرحمٰن کو اختیار دیا گیا تو انہوں نے بھی حضرت عثمانؓ کو ان پر فوقیت دی، شہادت عثمانؓ کے سلسلے میں ان پر تہمت لگی۔ ان سے حضرت طلحہ اور حضرت زبیر نے جنگ کی۔ سعد نے ان کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی اور گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے بعد حضرت معاویہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ انہوں نے ہر ممکن

طریقے سے خلافت حاصل کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے جنگ کی۔ خود ان کے ساتھی ان سے جدا ہو گئے اور حکومت سے قبل ان کے اصحاب بھی انہیں شک کی نظر سے دیکھتے رہے، وغیرہ۔ جب ابو جعفر منصور کا رویہ حضرت علیؓ اور علویوں کے بارے میں اس قسم کا تھا تو وہ طالبیوں کی اس شکایت کو کیوں کر قبول کرتا کہ امام مالک حضرت عثمانؓ کو حضرت علی پر فوقیت دیتے رہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ لیث بن سعد کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور امام مالک دونوں حضرت عثمان کی افضلیت کے قائل تھے۔ امام مالک نے حضرت علی سے کوئی حدیث بھی روایت نہیں کی، ان سے جب اس کا سبب معلوم کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مدینے میں موجود نہیں تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی اس رائے کی وجہ سے آزمائش میں ڈالے گئے۔ چناں چہ ہمارے لیے یحییٰ بن بکیر کی مذکورہ بالا روایت کو تسلیم کرنا ممکن نہیں۔ ہم تو طلاق مکرہ (زبردستی کی طلاق) والی روایت ہی کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہی بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی حقیقت ہے کہ امام مالک اور عباسیوں کے مابین تعلقات بہت جلد پائیدار ہو گئے تھے۔ عباسی ان سے اور دیگر علما وقت سے قربت کو اپنی حکومت کے استحکام کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان میں بعض خلفا آپ کی خدمت میں حاضری بھی دیتے تھے۔ مہدی عباسی نے ان سے موطا کی روایت کی ہے۔ امام مالک اور عباسی خلفا کی باہمی ملاقاتوں کے متعدد واقعات تاریخ میں محفوظ ہیں، جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عباسیوں نے اس جلیل القدر عالم کی بڑی قدر افزائی کی۔ بہت زیادہ ہدایا اور تحائف دیے اور حاکم مدینہ کے مساوی انہیں اقتدار بخشا، آپ جس کی گرفتاری کا حکم دیتے، وہ گرفتار ہو جاتا اور جس کو قابل تعزیر قرار دیتے، وہ سزا پاتا۔ اس سب کے باوجود امام مالک عباسیوں کی مکمل تائید وحمایت نہیں فرماتے تھے، اس لیے کہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کا مثالی نمونہ تو حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کی حکومتیں تھیں اور آپ اس بات کے متمنی رہتے کہ مسلمانوں کو ان ہی جیسا کوئی حکم راں نصیب ہو۔

علمی وفکری اعتبار سے دیکھیے تو دنیائے اسلام کے ہر خطے میں مسلمانوں نے دینی تعلیمات کی تدریس واشاعت میں قابل قدر کوششیں کی ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کی خدمت متعدد جہات سے کی۔ اس کی تفسیر، اس کی قراءتوں اور مفرد الفاظ پر قابل لحاظ کام ہوا۔ اس کے

پہلو بہ پہلو رسول کریم کی احادیث کی بھی مختلف حیثیتوں سے حفاظت واشاعت کا کام انجام پایا۔ رسول کریم کے اسوہ اور ان کی تعلیمات کی تحقیق وتفتیش ہوئی۔ صحابہ کی ایک بڑی تعداد جب جہاد کے لیے نکلتی تو لوگ ان کے گرد اکٹھا ہو جاتے، اور ہر جماعت میں ایسے افراد ہوتے، جو لوگوں کو قرآن وسنت کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ اس طرح کی کوششوں کے باوجود صحابہ کے مابین بھی آرا کا اختلاف ہوا۔ پھر تابعین اور تبع تابعین کے درمیان بھی فقہی اختلافات موجود رہے۔ اسی صورت حال کا ذکر لیث بن سعد امام مالک سے ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ پھر ان کے (یعنی صحابہ وتابعین کے) بعد لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ میں ان سب کی خدمت میں حاضر ہوا، مدینے میں بھی اور دوسرے شہروں میں بھی، ان میں سرفہرست ابن شہاب اور ربیعہ بن ابوعبدالرحمٰن تھے۔ امام مالک بعض وجوہ سے ربیعہ کے مخالف تھے۔ مجھے وہ وجہ معلوم تھی اور میں آپ سے اس کے بارے میں سن چکا تھا۔ اہل مدینہ میں سے یحییٰ بن سعید، عبیداللہ بن عمر اور کثیر بن فرقد جیسے اصحاب رائے کے موقف سے بھی باخبر تھا، جو سب کے سب ان سے عمر میں بڑے تھے۔ یہاں تک کہ آپ ربیعہ کی مجلس کو ترک کرنے پر مجبور ہو گئے، پھر میں نے آپ سے اور عبدالعزیز بن عبداللہ سے ربیعہ کی ایسی باتیں بھی ذکر کی تھیں، جنہیں میں ناپسند کرتا تھا تو آپ دونوں نے میری رائے سے اتفاق کیا، آپ دونوں ہی ان چیزوں کو ناپسند کرتے تھے، جو مجھے پسند نہیں تھیں۔

لیکن وہ فقہی اختلافات جن کا ذکر لیث بن سعد کے یہاں ملتا ہے۔ صرف مدینے ہی تک محدود نہ تھے، بل کہ عالم اسلام کے تمام خطوں میں اس قسم کے اختلافات پائے جاتے تھے اور اسی اختلاف کی وجہ سے وہ فکری سرمایہ وجود میں آیا، جس کی نظیر کسی اور مذہب یا تہذیب میں نہیں ملتی، مسلمانوں کو ایسا علمی وفکری ورثہ میسر آیا، جو ان کی زندگی وبقا کا ضامن بنا۔ تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ امام مالک ہی کے زمانے میں مذکورہ دینی علوم میں بعض ایسے علوم کی بھی آمیزش ہوئی، جو مسلمانوں اور عربوں کے لیے اجنبی تھے۔ جس کی بنا پر ان علوم کی نوعیت میں نئے قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اور ایسا اس وقت ہوا، جب عجمی ممالک میں لوگوں کی بڑی تعداد مشرف بہ اسلام ہوئی۔ اسلام لانے سے پہلے ان کا مخصوص فکری ودینی پس منظر تھا اور ان کی کچھ ایسی عادات واوصاف تھے، جو عربوں اور مسلمانوں کے لیے نامانوس تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ

اموی عہد میں دیگر علوم وآداب کے ترجموں کی ایک تحریک شروع ہوئی، جس کے نتائج عباسی عہد میں رونما ہوئے۔ چناں چہ نفسانی خواہشات اور بدعتوں کا ظہور ہوا اور طرح طرح کے فرقے وجود میں آئے اور ان کے درمیان مناظرے اور اختلافات شروع ہوگئے۔ چناں چہ شیعہ، خوارج، قدریہ، مرجئہ اور معتزلہ جیسے فرقے بن گئے۔ خلیفہ منصور کے زمانے میں خراسانی، رواندی اور زنادقہ جیسے غالی فرقے سامنے آئے۔ اس سب کے باوجود حجاز کا ماحول ان دینی اختلافات وآلودگیوں سے بڑی حد تک پاک تھا اور اہل مدینہ نے ان دینی وراثتوں کو اپنی اصل شکل میں باقی رکھا، جو وہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے موجود تھیں۔ چناں چہ وہاں مذہبی مناظروں کے فروغ کی گنجائش نہ رہی، بل کہ دین کی حفاظت اور اس کی اشاعت ہی کا کام انجام پایا۔ اسی لیے لوگ دینی معاملات میں اہل مدینہ کی آرا کو ترجیح دیتے تھے۔ خود امام مالک کے نزدیک بھی مدینے کو یہ امتیازی مقام حاصل تھا، لیث بن سعد اور امام مالک کے شاگردوں کی رائے بھی یہی تھی۔

مسلک

امام مالک ان گم راہ فرقوں کے حاملین اور نفس پرست قائدین سے بے زار تھے۔ ان کے اقوال اور آرا کے کم زوریاں واضح کرتے۔ ان کے سامنے جب اس طرح کے کسی شخص کا ذکر ہوتا تو وہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا یہ قول سنایا کرتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفا نے جو نمونہ چھوڑا ہے، اس کی پیروی ہی دراصل کتاب اللہ کی پیروی، اطاعت الٰہی کی تکمیل اور اللہ کے دین کو تقویت پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ کسی انسان کو اس میں تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں ہے اور نہ اس سے مخالف کسی شے کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جو شخص اسے اختیار کرے گا، وہ راہ یاب ہے اور جو اس کے ذریعے نصرت کا خواہاں ہوگا، اس کی مدد ہوگی اور جو اسے چھوڑ بیٹھے گا، وہ مومنین کی راہ سے ہٹ جائے گا اور اللہ اسے اسی راہ پر چلائے گا، جسے اس نے اختیار کیا ہے، پھر وہ جہنم کا ایندھن بنے گا اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے، یہ تھا گم راہ فرقوں کے بارے میں امام مالک کا موقف۔ چناں چہ وہ قرآن وسنت سے وابستگی، خلفائے راشدین، صحابہ اور مدینے کے اصحاب علم وتقویٰ کے اقوال پر اعتماد ہی کو دین سے صحیح

وابستگی قرار دیتے تھے اور وہ خود بھی اسی مسلک پر عامل تھے۔ ان کی تالیف المؤطا'' ان کے اسی مسلک کی واضح دلیل ہے۔ امام مالک کے ایک شاگرد ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ امام مالک سے یہ سوال کیا گیا کہ مؤطا میں آپ جب یہ فرماتے ہیں:

الامر المجتمع علیه

یہ بات متفق علیہ ہے:

یا

الامر عندنا وببلدنا

یہ مسئلہ ہمارے نزدیک یا ہمارے شہر میں معتبر ہے

ادرکت اهل العلم

میں نے اہل علم کو پایا ہے۔

اور

سمعت بعض اهل العلم

میں نے بعض اہل علم سے سنا ہے۔

تو ان بیانات کا کیا مطلب ہے؟

امام مالکؒ نے فرمایا کہ اس کتاب میں جو بات میں نے اپنی رائے کی حیثیت سے بیان کی ہے، وہ درحقیقت تنہا میری رائے نہیں ہے، بل کہ وہ متعدد اصحاب علم وفضل کی بھی رائے ہے اور ان حق پرست ائمہ کا بھی مسلک ہے۔ ان ہی سے میں نے وہ رائے اخذ کی ہے، وہ سب کے سب اصحاب تقویٰ وتدین تھے۔ ان افراد کا ذکر طوالت کا موجب ہوتا ہے، اس لیے میں نے اسے اپنی رائے کہنے پر اکتفا کیا اور وہ رائے میری بھی اس لیے ہے کہ ان کی رائے صحابہ ہی کی رائے ہے، انہوں نے بھی صحابہ کو اس پر عامل دیکھا اور میں نے بھی انہیں اس پر عامل دیکھا ہے تو گویا یہ ایک علمی ورثہ ہے، جو نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا ہوا ہمارے زمانے تک پہنچا ہے اور جس کا ذکر محض رائے کی حیثیت سے ہے تو وہ بھی ائمہ سلف کی ایک جماعت کی رائے ہے اور جس کا ذکر امر مجتمع علیہ کی حیثیت سے ہوا ہے تو وہ ایسا قول ہے، جس پر اہل فقہ اور اہل علم کا اجتماع ہو گیا ہے اور الامر عندنا کا مطلب وہ عمل ہے، جس پر ہمارے سامنے

لوگوں نے عمل کیا اور اسی کے مطابق فتوے دیے جاتے ہیں اور عالم و جاہل سب کے نزدیک وہ ایک معروف عمل بن گیا ہو اور یہی مفہوم الامر ببلدنا کا ہے اور جہاں میں نے بعض اہل علم کا ذکر کیا ہے تو اس سے مراد وہ اقوال ہیں، جو مجھے علما کے اقوال سے مستحسن معلوم ہوئے اور جن مسائل میں میں نے ان سے نہیں سنا، ان کے سلسلے میں اجتہاد سے کام لیا اور جن لوگوں سے ملاقات ہوئی، ان کے مسلک پر غور و خوض کرنے کے بعد حق سے قریب تر رائے میں نے اختیار کی اور اس کا خیال رکھا کہ وہ رائے اہل مدینہ کے مسلک و آرا سے متصادم نہ ہو اور اگر میں نے کوئی رائے کسی سے نہیں سنی تو اس پر سنت اور علماے سلف کے عمل کی روشنی میں میں نے خود اجتہاد کیا اور اس رائے کی نسبت اپنی طرف کی ہے۔ البتہ رسول کریم اور خلفائے راشدین کے عہد سے جو امور معمول بہا رہے ہیں تو ان سے میں نے اپنا قدم باہر نہیں نکالا۔

امام مالک کے اس طریقہ کار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ علمی روایت کے منتقل کرنے کے معاملے میں اپنے ہم عصر علما کی طرح تھے۔ البتہ ان کی روایتوں کے ماسوا ان کی تشریحات و تعبیرات انہیں ایک طرف تو بڑے مرتبے کا راوی بناتی ہیں تو دوسری طرف وہ ایک اعلیٰ پائے کے مجتہد ٹھہرتے ہیں۔ انہوں نے احادیث نبوی کے علاوہ مجتہدین کی آرا اور علما اہل مدینہ کے اقوال کی روایت بھی کی، اس کے باوجود وہ کسی حدیث کو اختیار کرنے میں مجتہدانہ بصیرت سے کام لیتے اور اس معاملے میں اس قدر محتاط تھے کہ امام شافعی جیسے فقیہ کی رائے یہ تھی کہ امام مالک کو اگر کسی حدیث کے بارے میں ذرا بھی شک ہو جاتا تو وہ پوری حدیث ہی ان کے نزدیک پایۂ اعتبار سے گر جاتی۔ ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو فرماتے سنا کہ یہ علم درحقیقت دین ہے، اس لیے تمہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تم کس طرح کے لوگوں سے اسے حاصل کر رہے ہو۔ میں نے اس مسجد (مسجد نبوی) میں ستر کے قریب افراد کو قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے سنا ہے (حدیث رسول بیان کرتے ہوئے) مگر میں نے ان سے ایک حدیث بھی نہیں لی۔ حال آں کہ اگر انہیں کسی بیت المال کا امین بنا دیا جاتا تو وہ اپنے کو اس کا اہل ثابت کرتے، مگر وہ اس فن کے لوگ نہ تھے۔

علم و فضل

امام مالک سے جو مسائل پوچھے جاتے، ان کے بارے میں آپ بہت زیادہ غور وفکر اور اجتہادی دقت نظر سے کام لیتے۔ ابن القاسم بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے یہ بات سنی ہے، وہ فرماتے تھے کہ دس سال سے زائد ہو گئے کہ ایک مسئلے پر غور کر رہا ہوں، مگر اب تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ وہ یہ بھی فرماتے تھے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میرے سامنے کوئی مسئلہ پیش ہوتا ہے اور میں اس پر غور کرتے ہوئے پوری رات گزار دیتا ہوں۔ ان بیانات سے یہ بات واضح ہے کہ امام مالک بہت غور وفکر سے کام لیتے تھے اور مسائل میں دقت نظر کے ساتھ اور طویل غور وفکر کے بعد ہی کوئی رائے قائم کرتے تھے۔ آپ سے جو مسئلے پوچھے جاتے، ان پر رائے دیتے وقت وہ اللہ سے ڈرتے بھی ہوئیں، کیوں کہ وہ اللہ کے دین کے معاملے میں گفت گو کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم ان کے اس قول سے ابھی واقف ہو چکے ہیں کہ یہ علم، دین کا معاملہ ہے تو تمہیں یہ ضرور دیکھنا چاہیے کہ تم کس قسم کے لوگوں سے اسے حاصل کر رہے ہو۔ چناں چہ یہ کسی حیرت اور تعجب کی بات نہیں ہے کہ ہمارے اسلاف امام مالک کی مروی احادیث پر مکمل اعتبار واعتماد کرتے تھے، وہ امام مالک کو ثقہ راوی کی حیثیت دیتے تھے اور خود ان کے شیوخ پر انہیں فوقیت دیتے تھے۔ ابن عبدالحکیم کا بیان ہے کہ امام مالک، یحییٰ بن سعید، ربیعہ اور نافع کے زمانے میں فتوے دیا کرتے تھے اور امام مالک کا حلقۂ درس نافع کے حلقۂ درس سے بھی بڑا تھا۔ یہ امام مالک کے معاصرین کی جانب سے نافع پر ان کی فوقیت اور برتری کا کھلا ہوا اعتراف ہے، جب کہ حضرت نافع کا علم وفضل اور ان کے مرتبے کی بلندی ایک مسلم الثبوت حقیقت تھی، وہ فقیہ مدینہ کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ ان کے معاصرین نے انہیں جو فضیلت کا مقام دے رکھا تھا اور ان سے استفادہ کی خاطر آپس میں ان کی جو مسابقت ہوا کرتی تھی، اس وجہ سے بھی ابن اسحاق اور ابن ابی ذویب جیسے بعض علما نے بر بنائے حسد ان کے بارے میں بعض نامناسب باتیں کہی ہیں۔ ان کے بغض ونفرت کا دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ امام مالک ان سے اختلاف رکھتے تھے اور بعض معاملات میں ان پر طعن کرتے تھے۔ ان سب کے باوجود امام مالک پر معترض یہ علما بھی امام مالک کی روایت کردہ کسی حدیث پر کسی تنقید واعتراض کی جرأت نہیں کر سکے۔ ان کے اعتراضات کا نشانہ امام مالک کی فقہی آرا بنتی تھیں یا پھر امام کے بعض خاص معمولات، مثلاً نماز باجماعت سے ان کی غیر

حاضری یا جنازے کی نماز یا مریض کی عیادت کے لیے نہ جانا، جب کہ وہ امرا کی زیارت کیا کرتے تھے، حال آں کہ یہ باتیں آپ کی زندگی کے آخری ایام کی ہیں، جب کہ آپ کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ چناں چہ امام مالک سے منسوب یہ باتیں آپ کی علمی شان ومنزلت کو کم نہیں کرتیں اور نہ ہی ان کی روایت کی صحت میں خلل انداز ہوتی ہیں۔

مؤطا کی تصنیف

المؤطا کو صحت کے اعتبار سے امتیازی درجہ حاصل ہے، اس لیے کہ وہ حدیث کے اولین مجموعوں میں شمولیت کا اعزاز رکھتی ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن الخطابؓ نے جب احادیث نبوی کی تدوین کا ارادہ کیا اور صحابہ کرام سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو انہوں نے آپ کے اس ارادے کی تائید کی تھی، اس کے باوجود وہ اپنے اس ارادے پر محض اس اندیشے سے عمل نہ کر سکے کہ کہیں لوگ قرآن وحدیث میں التباس کا شکار نہ ہو جائیں۔ اس طرح صحابہ کرام نے بھی عموماً احادیث کے لکھنے کا اہتمام نہ کیا، وہ انہیں اپنی یادداشت میں محفوظ رکھتے اور حفظ کی بنیاد پر ہی وہ دوسروں تک منتقل کرتے۔ البتہ کچھ صحابہ احادیث کو لکھ لیا کرتے تھے۔ امام بخاری نے کتاب العلم میں ابو ہریرہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ اصحاب رسول میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ حدیثیں بیان کرنے والا نہ تھا، سوائے عبداللہ بن عمرو کے کہ وہ حدیثیں لکھ لیتے تھے اور میں نہیں لکھتا تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانے میں مختلف شہروں میں حدیث اور فقہ کی تعلیم کے لیے ہدایات جاری کی تھیں اور علمائے مدینہ کو بہ طور خاص اس کی تاکید کی تھی۔ انہوں نے ابوبکر بن محمد بن حزم کو بھی حکم دیا تھا کہ انہیں رسول کریم کی جو احادیث بھی مل جائیں یا حضرت عمر کے جو اقوال ملیں وہ ان سب کو لکھ کر محفوظ کر لیں، تاکہ حفاظ کے اٹھ جانے سے ان کے ضیاع کا اندیشہ باقی نہ رہے۔ یہ سب تدوین حدیث نبوی کی ابتدائی مثالیں تھیں، امام سیوطی نے تنویر الحوالک میں لکھا ہے کہ احادیث کی تدوین وتبویب کا سلسلہ تابعین کے آخری زمانے میں شروع ہوا، جب کہ علما مختلف شہروں میں پھیل گئے اور خوارج اور روافض اور منکرین تقدیر نے بے شمار بدعتیں ایجاد کر لی تھیں۔ اس وقت جن لوگوں نے احادیث کو موضوعاتی اعتبار سے جمع کرنے کا اہتمام کیا، ان میں ربیع بن صبیح اور سعد بن ابی عروبہ وغیرہ کا

نام خاص طور سے قابل ذکر ہے۔ پھر دوسری صدی ہجری کے نصف میں طبقۂ ثالثہ (تیسرے طبقے) کے علما نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور انہوں نے احکام دین کی تدوین کی، چناں چہ امام مالک نے بھی الموطا تصنیف کی اور اس میں اہل حجاز کی قوی احادیث جمع کیں اور اقوال صحابہ اور تابعین و تبع تابعین کے فتاویٰ بھی درج کیے۔ چناں چہ امام مالک کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے، جنہوں نے صحیح احادیث کی تدوین میں اولیت کا شرف حاصل کیا اور روایتوں کے قبول کرنے میں حد درجہ احتیاط ملحوظ رکھی۔ حدیث کے متن اور سند دونوں کی بڑی باریک بینی کے ساتھ چھان پھٹک کی۔ ابن عیینہ کہتے ہیں کہ میں نے علم کے حصول میں امام مالک سے بہتر اور بلند پایہ کوئی شخص نہیں دیکھا اور نہ ہی رجال حدیث اور علمائے روایت پر نقد کرنے کے معاملے میں ان سے سخت کوئی آدمی پایا۔ امام مالک غالباً پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فن حدیث کو وضع کیا، اس لیے کہ ان سے پہلے کسی ایسے عالم کا ذکر نہیں ملتا جس نے راویوں پر نقد کی بات کی ہو یا راویوں اور علما کی روایات واقوال کو قبول کرنے میں سخت گیر اصول اپنائے ہوں۔ امام مالک نے مسائل فقہیہ کے سلسلے میں بھی وہی طریقہ اپنایا ہے، جو روایات کے سلسلے میں ان کے یہاں نظر آتا ہے۔ ان کی موطا، حدیث، تفسیر، فقہ اور تاریخ جیسے علوم ومباحث کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس وقت تک علوم کی وہ حد بندی نہیں ہوئی تھی جو آج ہمیں نظر آتی ہے۔ طبری نے عباس بن ولید اور ابراہیم بن حماد کے واسطے سے امام مالک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان سے خلیفہ مہدی نے کہا کہ اے ابوعبداللہ! کوئی ایسی کتاب تصنیف کیجیے جسے امت کا دستور العمل بنادیا جائے تو انہوں نے جواب دیا کہ اے امیر المومنین! جہاں تک مغرب کے علاقے کا سوال ہے تو وہاں آپ کی خواہش پوری ہو رہی ہے۔ شام میں وہ شخص ہے، جس کی عظمت کا آپ کو بھی علم ہے (یعنی امام اوزاعی)، رہے اہل عراق تو وہ اہل عراق ہیں (یعنی ہر علاقے کے افراد کو اپنے علما کے مسلک پر چلنے کی آزادی ہونی چاہئے) اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ موطا کی تصنیف خلیفہ مہدی کی تحریک پر عمل میں آئی۔ لیکن طبری ہی کی ایک دوسری روایت اس کے خلاف جاتی ہے۔ یہ محمد بن عمر کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک بن انس کو یہ فرماتے سنا کہ جب ابوجعفر منصور حج کے لیے آئے تو انہوں نے مجھے بلایا اور مجھ سے گفت گو کی، مجھ سے کچھ سوالات کیے، میں نے ان کے جوابات دیے تو انہوں نے کہا کہ

میں نے یہ طے کیا ہے کہ آپ کی اس کتاب کے متعدد نسخے تیار کرا کر بلاد اسلامیہ میں تقسیم کراؤں اور مسلمانوں کو حکم دے دوں کہ وہ اسی کتاب کو اپنا دستور العمل بنائیں اور اس کے علاوہ تمام احادیث واقوال سے صرف نظر کرلیں، اس لیے کہ میرا خیال یہ ہے کہ صحیح علم صرف اہل مدینہ ہی کا علم ہے۔ میں نے ان سے کہا: امیر المومنین! آپ ایسا ہرگز نہ کیجیے، اس لیے کہ لوگوں کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور علما کے اقوال دوسرے ذرائع سے پہنچ چکے ہیں اور انہیں انہوں نے اپنا دستور العمل بنالیا ہے اور ان سے یک گونہ قربت بھی ہوگئی ہے، اس لیے اب ان کے معتقدات سے انہیں الگ کرنا ایک مشکل کام ہوگا، اس لیے لوگوں کو ان کے اپنے حال پر اور اپنے مسلک پر چھوڑ دیجیے۔ انہوں نے کہا کہ بہ خدا! اگر آپ میرے ہم خیال ہوتے تو میں ضرور اس کا حکم دے دیتا۔ ابن جریر طبری نے یہ دوسری روایت بھی جو پہلی روایت کی معارض ہے، بغیر اپنا ترجیحی رجحان ظاہر کیے نقل کردی۔ میرا خیال یہ ہے کہ یہ دونوں ہی روایتیں نا قابل قبول ہیں۔ مہدی ۱۵۸ھ میں عباسی خلافت کا وارث ہوا تھا، اس وقت امام مالک کی عمر تقریباً ۶۵ سال تھی، گویا وہ ان کی زندگی کے آخری ایام تھے۔ مہدی نے دور امارت میں امام مالک سے موطا کی روایت کی تھی تو وہ دور خلافت میں ان سے اس کتاب کی تصنیف کا مطالبہ کیسے کرسکتا ہے؟ دوسری روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام مالک کا علم بلاد مغرب میں ہر جگہ پھیل چکا تھا۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ علم وہی علم تھا، جو موطا میں مدون ہو چکا تھا یا اس کے علاوہ کوئی اور علم تھا؟ اگر یہ وہی علم ہے جو موطا کی شکل میں مدون ہو چکا تھا تو کیا وہ مدون حالت میں مغرب تک پہنچا یا غیر مدون حالت میں؟ اور نص سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امام مالک نے جتنی کتابیں بھی تصنیف کی تھیں، وہ سب کی سب منصور سے ملاقات سے قبل کی تصنیف شدہ ہیں، پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا منصور ان تصنیفات سے بے خبر تھا کہ اسے امام مالک سے کتابوں کے نسخے تیار کرانے کا مطالبہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تاکہ تمام علاقوں کے لیے انہیں دستور العمل بنادیا جائے۔ یہ بات معلوم ہے کہ علمائے عراق کے بارے میں امام مالک کی ایک مخصوص رائے تھی۔ اسی طرح علمائے عراق کا بھی امام مالک کے سلسلہ میں ایک متعین موقف تھا۔ پھر کیا منصور عراقی علما یا دیگر علاقوں کے علما کی تائید حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا تھا؟ ممکن ہے کہ منصور اس کی خواہش رکھتا ہو، مگر اسے اس

بات کا ادراک ہو گیا تھا کہ اس کی یہ خواہش روبہ عمل نہیں آسکتی۔

اب رہا یہ سوال کہ موطا کی تصنیف کب عمل میں آئی تو اس کا تعین خاصا دشوار ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ دس ہزار احادیث سے منتخب کردہ مجموعہ ہے۔ امام مالک ہر سال اس ذخیرۂ احادیث پر نظر ثانی کرتے اور اس میں سے کچھ حدیثیں کم کرتے رہے تھے، یہاں تک کہ اتنی حدیثیں باقی رہ گئیں، جو ہمارے سامنے موطا کی شکل میں موجود ہیں۔ تصنیف کے اس طریق کار سے ہم بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تصنیف میں کئی سال لگ گئے، اگرچہ سیوطی نے امام مالک کے حوالے سے اس کی مدتِ تصنیف چالیس سال بتائی ہے۔

علما کی ایک بڑی تعداد نے امام مالک سے موطا کی روایت کی ہے۔ امام سیوطیؒ کہتے ہیں کہ امام مالک سے روایت کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ کسی دوسرے امام سے اتنے راوی نہیں ہیں۔ ان راویوں نے مختلف شہروں میں فقہ مالکی کی نمائندگی کی۔ مصر میں مالکی مدرسہ امام مالک کی تعلیمات کی اشاعت اور موطا کی روایت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ مصریوں ہی کے واسطے سے مسلک مالکی مغرب اور اندلس میں رائج ہوا۔ اس کے بعد وہاں کے علما امام مالک سے براہِ راست استفادہ کرنے کے لیے آنے لگے۔ ابن خلدون کہتے ہیں کہ اہل مغرب اور اہل اندلس میں مسلک مالکی کے رائج ہونے کی وجہ یہ تھی کہ وہ لوگ اکثر و بیش تر حجاز کا سفر کیا کرتے تھے اور وہی ان کے اسفار کی آخری منزل ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مدینے کو علمی مرکز کی حیثیت حاصل تھی اور وہیں سے یہ علم عراق تک پہنچا، جب کہ عراق اہل مغرب یا اندلسیوں کے راستے میں نہیں آتا تھا۔ چناں چہ انہوں نے علمائے مدینہ سے استفادے پر اکتفا کیا، اس زمانے میں امام مالک ہی علماء مدینہ کے استاد اور امام تھے، امام مالک سے پہلے ان کے اساتذہ سے اور امام مالک کے بعد ان کے شاگردوں سے علمی استفادے کا سلسلہ جاری رہا۔ چناں چہ مغرب اور اندلس والے مسلک مالکی کے حلقہ بہ گوش رہے اور دوسروں کی طرف قطعاً توجہ نہ کی۔

اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ عبدالملک بن حبیب نے سب سے پہلے اندلس میں مسلک مالکی کی اشاعت کی اور اندلسیوں میں امام مالک کے سب سے مشہور شاگرد کا نام یحییٰ بن یحییٰ اندلسی ہے، جن کے واسطے سے موطا کی روایت زیادہ عام ہوئی اور ان کے علاوہ دوسرے شاگردوں

کی روایات کو رواج نہ مل سکا۔ وہ اندلس کی حکومت میں اتنے اثر ورسوخ کے مالک تھے کہ ان کے مشورے کے بغیر کسی کو منصب قضا پر فائز نہیں کیا جاتا تھا۔ چناں چہ وہاں کے تمام قاضی یا تو ان کے رفیق تھے یا ان کے شاگرد۔ ایسا بلند مرتبہ مصر کے لیث بن سعد کے سوا امام مالک کے کسی شاگرد کو حاصل نہ ہوا۔ لیکن لیث بن سعد خود ایک مجتہد فقیہ کا درجہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بعض مسائل میں امام مالک سے اختلاف بھی کیا ہے۔ امام مالک کے نام ان کے خطوط میں یہ اختلافی مسائل مذکور ہیں۔ یحییٰ بن یحییٰ کی روایات کے مشہور ہونے اور دوسروں کی روایات کے باقی نہ رہنے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب اندلس کی اموی حکومت کا ان کے تئیں ترجیحی رویہ تھا، کیوں کہ اس حکومت کی یحییٰ بن یحییٰ پر خاص نظر عنایت تھی۔